

تفہیم القرآن

الواقعة

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْوَاقِعَہ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔
 زمانہ نزول | حضرت عبداللہ بن عباس نے سورتوں کی جو ترتیب نزول بیان کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورہ طہ نازل ہوئی، پھر الواقعة اور اس کے بعد الشعراء (الاتقان للشیوطی)، یہی ترتیب بخاری نے بھی بیان کی ہے (بیہقی، دلائل النبوة)

اس کی تائید اُس قصہ سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمر اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو سورہ طہ پڑھی جا رہی تھی۔ اُن کی آہٹ سُن کر ان لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیئے حضرت عمر پیدل پہنچے اور جب بہن اُن کو پچانے آئیں تو اُن کو بھی نازا یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بہن کا خون بہتے دیکھ کر حضرت عمرؓ کو سخت ندامت ہوئی اور انہوں نے کہا، اچھا مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپایا ہے۔ دیکھیں تو وہی اس میں کیا لکھا ہے۔ بہن نے کہا ”آپ اپنے شکر کی جو سے بخش ہیں، وَاِنَّهٗ لَا يَمَسُّهَا الْاَلطَّاهُ، اس صحیفے کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے۔“ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحیفے کو لے کر پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُس وقت سورہ واقعة نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اسی میں آیت لَا يَمَسُّهَا اِلَّا الْمُطَهَّرُونَ وارد ہوئی ہے اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ ہجرت حبشہ کے بعد ۵۷ھ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفار مکہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب زیادہ جس چیز کو ناقابل یقین قرار دیتے تھے وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہوگی

جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ جلا اٹھائے جائیں گے اور ان کا محاسبہ ہوگا اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہگار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں جن کا عالم واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آجائے گا اس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ کسی کی یہ طاقت ہوگی کہ اسے آتے آتے روک دے، یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے۔ اس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک، سابقین۔ دوسرے، عام صالحین۔ تیسرے وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور متے دم تک کفر و شرک اور گناہ کبیرہ پر جمے رہے۔ ان تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آیت ۷۵ سے ۸۲ تک اسلام کے ان دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے درپے دلائل دیئے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفار انکار کر رہے تھے، یعنی توحید اور آخرت۔ ان دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے ویسے ہوتے سامانِ زیست پر پل رہا ہے اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے، یا اس کے سما کسی اور کی بندگی بجالانے کا آخرتجے سخی کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا غافل و در ماندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لاسکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں ان کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ باری تعالیٰ، یہ عظیم الشان نعمت تمہارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصہ اس نعمت میں بی رکھا ہے کہ اسے جھٹلانے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹی باتیں

برتتے ہو۔ قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتہ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوقات کی دستِ رَس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں حالانکہ لوح محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعہ سے یہ پہنچتی ہے اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی سن ترانیاں ہانکے اور اپنی خود مختاری کے گھنڈے میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اغوا ہو جائے، مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اُس وقت تو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں پچا سکتا۔ اپنی اولاد کو نہیں پچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پیشواؤں اور محبوب ترین بیدروں کو نہیں پچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اوپر فرما نہ تو انہیں ہے اور تیرا یہ زعم درست ہے کہ دنیا میں بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے، تو کسی مرنے والے کی تکلفی ہوئی جان کو پٹیا کیوں نہیں لانا؟ جس طرح تو اس معاملہ میں بے بس ہے اسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے موت کے بعد ہر مرنے والا اپنا انجام دیکھ کر رہے گا۔ مقررین میں سے ہو تو مقررین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا۔ اور جھٹلانے والے مگر انہوں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لیے مقرر

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ نہ وبالاً کر دینے والی آفت ہوگی۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح دیزہ

لے اس فقرے سے کلام کا آغاز خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو اُس وقت کفار کی مجلسوں میں قیامت کے خلاف بنائی جا رہی تھیں۔ زمانہ وہ تھا جب مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نئی نئی اسلام کی دعوت سن رہے تھے۔ اُس میں جو چیز انہیں سب سے زیادہ عجیب اور عبیداز عقل و امکان نظر آتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک روز زمین و آسمان کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں سب اگلے پچھلے مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات سن کر حیرت سے اُن کے دیدے پھٹے پھٹے رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آخر یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ چاند، یہ سورج کہاں چلے جائیں گے؟ صدیوں کے گڑے مُردے کیسے جی اٹھیں گے؟ مرنے کے بعد دوسری زندگی، اور پھر اس میں بہشت کے باغ اور جہنم کی آگ، آخر یہ خواب و خیال کی باتیں عقل و ہوش کتے ہوئے ہم کیسے مان لیں؟ یہی چو میگزینیاں اُس وقت مکہ میں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔ اس پس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی اُسے جھٹلانے والا نہ ہوگا۔

اس ارشاد میں قیامت کے لیے "واقعہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جس کے لیے اُردو زبان میں ہرنی شدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں، یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آکر ہی رہنا ہے پھر اس کے پیش آنے کو "واقعہ" کہا گیا ہے جو عربی زبان میں کسی بڑے حادثہ کے اچانک برپا ہوجانے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن لَوْفَعْتَهَا كَاذِبَةٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وقوع کمال جانا اور اس کا آتے آتے ٹرک جانا اور اُس کی آمد کا پھیر دیا جانا ممکن نہ ہوگا، یا بالفاظ دیگر کوئی طاقت پھر اُس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ کوئی متنفس اُس وقت یہ چھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

لے اصل الفاظ میں خافضة رافضة۔ گرانے والی اور اٹھانے والی۔ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا

بیزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔
 تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے:
 دائیں بازو والے، سو دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی، کا کیا کہنا۔
 اور بائیں بازو والے، تو بائیں بازو والوں کی بد نصیبی، کا کیا ٹھکانا۔

ہے کہ وہ سب کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ نیچے کی چیزیں اوپر اور اوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا
 مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گروہ ہوتے لوگوں کو اٹھانے والی اور اٹھے ہوتے لوگوں کو گرانے والی ہوگی
 یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزت و ذلت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہوگا۔ جو دنیا میں
 عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔
 ۳۔ یعنی وہ کوئی مقامی زلزلہ نہ ہوگا جو کسی محدود علاقے میں آئے، بلکہ پوری کی پوری زمین بیک وقت
 ہلا ماری جائے گی۔ اُس کو بکثرت ایک زبردست جھٹکا لگے گا جس سے وہ لرز کر رہ جائے گی۔

۴۔ خطاب اگرچہ بظاہر اُن لوگوں سے ہے جنہیں یہ کلام سنایا جا رہا تھا، یا جو اب اسے پڑھیں یا نہیں،
 لیکن دراصل پوری نوع انسانی اس کی مخاطب ہے۔ تمام انسان جو اول روز آفرینش سے قیامت تک پیدا
 ہوتے ہیں وہ سب آخر کار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

۵۔ اصل میں لفظ اصحاب المیمنہ استعمال ہوا ہے۔ میمنہ عربی قاعدے کے مطابق یمن سے بھی ہو سکتا
 ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں، اور یمن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں قال نیک۔ اگر اس کو یمن
 سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے ”سیدھے ہاتھ والے“ لیکن اس سے لغوی معنی مراد نہیں
 ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے عالی مرتبہ لوگ۔ اہل عرب سیدھے ہاتھ کو قدرت اور رفعت اور عزت کا نشان
 سمجھتے تھے جس کا احترام مقصود ہوتا تھا اسے مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا
 کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے فلاں صقی بالیمین، ”وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے“
 اردو میں بھی کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دست راست اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کا خاص آدمی ہے۔
 اور اگر اس کو یمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔

۱۴ اصل میں لفظ اصحاب المشتمہ استعمال ہوا ہے۔ مشتمہ، شتم سے ہے جس کے معنی بدبختی، نحوست اور بدفالی کے ہیں۔ اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شتمی کہا جاتا ہے۔ اردو میں شرمی قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ اہل عرب شمال رہائیں ہاتھ، اور شوم (خال بد) کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بائیں ہاتھ کمزوری اور ذلت کا نشان تھا۔ سفر کر جاتے ہوئے اگر پرندہ اگر کراہیں ہاتھ کی طرف جانا تو وہ اس کو بُری خال سمجھتے تھے کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اسے کمزور سے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے ہاں اس کی کوئی عزت نہیں تو کہا جاتا کہ فلان صغی بالشمال، ”وہ میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے۔“ اردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے پس اصحاب المشتمہ سے مراد میں بدبخت لوگ، یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت سے دوچار ہونگے اور دوبار الہی میں بائیں طرف کھڑے کیے جائیں گے۔

۱۵ سابقین (آگے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی اور حق پرستی میں سب پر سبقت لے گئے ہوں، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے ہوں، خدا اور رسول کی مچا پر سب سے پہلے تلبیک کہنے والے ہوں، جہاد کا معاملہ ہو یا اتفاق فی سبیل اللہ کا یا خدمتِ خلق کا یا دعوتِ خیر اور تبلیغِ حق کا، غرض دنیا میں بھلائی پھیلانے اور بُرائی مٹانے کے لیے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا جو موقع بھی پیش آئے اس میں وہی آگے بڑھ کر کام کرنے والے ہوں۔ اس بنا پر آخرت میں بھی سب سے آگے وہی رکھے جائیں گے۔ گویا وہاں اللہ تعالیٰ کے دربار کا نقشہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو میں صالحین، بائیں بازو میں فاسقین، اور سب سے آگے بارگاہِ خداوندی کے قریب سابقین۔ حدیث میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا ”جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچ کر اللہ کے سایہ میں جگہ پائیں گے؟“ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے۔ فرمایا الذین اذا اعطوا الحق قیلوا، واذا منیوا بذلوا، وحکموا الناس حکمکم لانفسہم، ”وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے حق پیش کیا گیا انہوں نے قبول کر لیا، جب ان سے حق مانگا گیا انہوں نے ادا کر دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں ان کا

انگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔ مرتعِ نختوں پر نیکی لگاتے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ اُن کی مجلسوں میں آبدی لڑکے شہِ شہابِ چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹرا اور ساغر لے دوڑتے پھرتے ہونگے جسے فیصلہ وہی کچھ تھا جو خود اپنی ذات کے معاملہ میں تھا“ (مسند احمد)

شہِ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اولین اور آخرین یعنی انگلوں اور پچھلوں سے مراد کون ہیں ایک گروہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جتنی امتیں گزری ہیں وہ اولین ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قیامت تک کے لوگ آخرین ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بعثتِ محمدی سے پہلے ہزار ہا برس کے دوران میں جتنے انسان گزرے ہیں اُن کے سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور حضور کی بعثت کے بعد سے قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے جو لوگ سابقین کا مرتبہ پائیں گے اُن کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں اولین و آخرین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولین و آخرین ہیں۔ یعنی آپ کی امت میں ابتدائی دور کے لوگ اولین ہیں جن میں سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور بعد کے لوگ آخرین ہیں جن میں سابقین کی تعداد کم ہوگی۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ہر نبی کی امت کے اولین و آخرین ہیں، یعنی ہر نبی کے ابتدائی چرووں میں سابقین بہت ہونگے اور بعد کے آنے والوں میں وہ کم پائے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ ان تینوں مفہوموں کے حامل ہیں اور بعینہ نہیں کہ یہ تینوں ہی صحیح ہوں، کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور مطلب بھی ان الفاظ سے نکلتا ہے اور وہ بھی صحیح ہے کہ ہر پہلے دور میں انسانی آبادی کے اندر سابقین کا تناسب زیادہ ہوگا اور بعد کے دور میں ان کا تناسب کم نکلیے گا۔ اس لیے کہ انسانی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے، سبقت فی الخیرات کے نکلنے والوں کی تعداد اسی رفتار سے نہیں بڑھتی۔ گنتی کے اعتبار سے یہ لوگ چاہے پہلے دور کے سابقین سے تعداد میں زیادہ ہوں، لیکن بحیثیتِ مجموعی دنیا کی آبادی کے مقابلے میں ان کا تناسب گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

۹۔ اس سے مراد یہی ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اُن کی عمر ہمیشہ ایک ہی حالت پر ٹھہری رہے گی۔ حضرت علیؑ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اہل دنیا کے وہ بچے ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے، اس لیے نہ ان کی کچھ نیکیاں ہونگی کہ ان کی جزا پائیں اور نہ بدیاں ہونگی کہ ان کی سزا پائیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سے مراد صرف وہی اہل دنیا ہو سکتے ہیں جن کو جنت نصیب نہ ہوئی ہو۔ رہے مومنین صالحین، تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ

پنی کرنا ان کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔ اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں، اور پرندوں کے گروشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں۔ اور ان کے لیے خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہونگی، ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی۔

نہ خود قرآن میں یہ ضمانت دی ہے کہ ان کی ذریت ان کے ساتھ جنت میں لاملاتی جائے گی (الطور، آیت ۲۱)، ایسی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو داؤد و طیالسی، طبرانی اور ترمذی نے حضرت انس اور حضرت عمر بن عبد رب سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کے بچے اہل جنت کے خادم ہونگے۔ (ذکر تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۶۔ الطور، حاشیہ ۱۹)

نقل تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۷۔ سورہ محمد، حاشیہ ۲۲۔ الطور

حاشیہ ۱۸۔

اللہ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، تفسیر سورہ طور، حاشیہ ۱۷۔

اللہ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۲۸۔ ۲۹۔ الدخان، حاشیہ ۲۲۔

الرحمن، حاشیہ ۵۱۔

۳۔ یہ جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے، جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، کہ انسان کے کان وہاں بیہودگی، یادہ گوئی، جھوٹ، غیبت، جعلی، بہتان، گالی، لات و گزاف، طنز و تمسخر اور طعن و تشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہوئے گا۔ وہ بد زبان اور بد تکبر لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کھڑے اچھا لیں۔ وہ شریف اور مہذب لوگوں کا معاشرہ ہوگا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہوگی۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے کچھ بھی ثناء کی اور مذاق سلیم سے نوازا ہو تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیاوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے انسان کو حقیقت میں نجات پانے کی امید دلائی گئی ہے۔

۴۔ اصل الفاظ میں الاقیلاً سلاماً سلاماً۔ بعض مفسرین و مترجمین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ

اور وائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ بے خار سیر لیل، اور تہ برتہ چڑھے ہوئے کیوں، اور دود تک پھیلی ہوئی چھاؤں، اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھولوں، اور اونچی نشست گا ہوں میں ہونگے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے، اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم ۱۹۔

وہاں ہر طرف سلام سلام ہی کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہے قول سلیم یعنی اسی گفتگو جو عیوب کلام سے پاک ہو، جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو پچھلے فقرے میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں سلام کا لفظ قریب قریب اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے انگریزی میں لفظ SAME استعمال ہوتا ہے۔
۱۵۔ یعنی ایسی بیویاں جن کے درختوں میں کانٹے نہ ہونگے۔ ایک شخص تعجب کا اظہار کر سکتا ہے کہ پیرا لیا کونسا نصیب پھل ہے جس کے جنت میں ہونے کی خوشخبری سنائی جلتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنت کے بیروں کا تو کیا ذکر، خود اس دنیا کے بھی بعض علاقوں میں یہ پھل اتنا لذیذ، خوشبودار اور میٹھا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر جتنے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، ان کے درختوں میں کانٹے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے جنت کے بیروں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے درخت بالکل ہی کانٹوں سے خالی ہونگے، یعنی ایسی بہترین قسم کے ہونگے جو دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

۱۶۔ اصل الفاظ ہیں لَا مَشْطُوعَةٌ وَلَا مَمْنُوعَةٌ۔ لا مشطوعہ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہونگے کہ موسم گزر جانے کے بعد وہ نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لیے جائیں تو ایک مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے، بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے لگتا ہے پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ اور لا ممنوعہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی، نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں کوئی امر مانع ہوگا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

۱۷۔ اس سے مراد دنیا کی وہ نیک خوانین ہیں جو اپنے ایمان و عمل صالح کی بنا پر جنت میں جائیں گی اللہ تعالیٰ ان سب کو وہاں جو ان بنا دیگا، خواہ وہ کتنی ہی بڑھی ہو کر مری ہوں۔ نہایت خوبصورت بنا دیگا، خواہ دنیا میں وہ

حسین ہی ہوں یا نہ رہی ہوں۔ باکرہ بنا دیگا، خواہ دنیا میں وہ کنواری مری ہوں یا بال بچوں والی ہو کر۔ ان کے شوہر بھی اگر ان کے ساتھ جنت میں پہنچیں گے تو وہ ان سے ملا دی جائیں گی، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی اور عذبتی سے ان کو سزا دیگا۔

اس آیت کی یہی تشریح متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ شبلی ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بڑھیا نے حضور سے عرض کیا میرے حق میں جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہوگی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ "اُسے بناؤ، وہ بڑھاپے کی حالت میں داخل جنت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انہیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور باکرہ بنا دیں گے۔"

ابن ابی حاتم نے حضرت سلمہ بن بزید کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے اس آیت کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا، "اس سے مراد دنیا کی عورتیں ہیں، خواہ وہ باکرہ مری ہوں یا شادی شدہ۔" طبرانی میں حضرت ام سلمہ کی ایک طویل روایت ہے جس میں وہ جنت کی عورتوں کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات کا مطلب حضور سے دریافت فرماتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضور اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ھت اللواتی فی جنن فی دار الدنيا عجا ئز م صا ن شط ا خلقن اللہ بعد الکبر ف جعلهن عذ اری یر وہ عورتیں ہیں جو دنیا کی زندگی میں مری ہیں۔ بوڑھی بھونس، آنکھوں میں چیڑ، سر کے بال سفید۔ اس بڑھاپے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر سے باکرہ پیدا کر دے گا۔"

حضرت ام سلمہ پر چمتی ہیں اگر کسی عورت کے دنیا میں کمی شوہر ہر چکے ہوں اور وہ سب جنت میں جائیں تو وہ ان میں سے کس کو ملے گی؟ حضور فرماتے ہیں انھا تختیر فختار احسن خلقا فتقول یا رب ان هذا کان احسن خلقا معی فزوجنیہا، یا ام سلمہ، ذہب حسن الخلق بخیو الدنيا والاخرة یر اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جسے چاہے چن لے، اور وہ اس شخص کو چنے گی جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ اے رب، اس کا بناؤ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا اس لیے مجھے اسی کی بیوی بنا دے۔ اے ام سلمہ، حسن اخلاق دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی لوٹ لے گیا ہے، مگر مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورہ رحمن، ما شیلہ ۱۵، ۱۶۔ اصل میں لفظ عذوباً استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایسی عورت ہے جو طہار ہو، خوش اطوار ہو، خوش گفتار ہو، نسوانی جذبات سے

یہ کچھ داتیں بازو والوں کے لیے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہونگے اور پھیلوں میں سے بھی بہت۔
 اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بد نصیبی کا کیا پوچھنا۔ وہ لوکی لپٹ اور کھولتے ہوئے
 پانی اور کالے دھوئیں کے سایے میں ہونگے جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہونگے جو اس انجام کو
 پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جیب ہم مرکز خاک ہو جائیں گے
 اور ٹہنیوں کا پیچرہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی
 اٹھاتے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟ اے نبی، ان لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک
 دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔ پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو،
 بریز ہو، اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

۱۹ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہوگی۔ دوسرا یہ کہ وہ آپس میں ہم سن
 ہوگی، یعنی تمام جنسی عورتیں ایک ہی عمر کی ہونگی اور ہمیشہ اسی عمر کی رہیں گی۔ بعد نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں یک وقت
 صحیح ہوں، یعنی یہ خواتین خود بھی ہم سن ہوں اور ان کے شوہر بھی ان کے ہم سن بنا دیئے جائیں۔ ایک حدیث میں
 آتا ہے کہ یدخل اهل الجنة الجنة جردا ودا بیضا جعادا مکھلین ابنا ثلاث وثلاثین۔ اہل جنت
 جب جنت میں داخل ہونگے تو ان کے جسم بالوں سے صاف ہونگے۔ مسیں بھیگ رہی ہونگی مگر ڈاڑھی نہ نکلی
 ہوگی۔ گورے چٹے ہونگے۔ گٹھے ہوئے بدن ہونگے۔ آنکھیں سرگمیں ہونگی۔ سب کی عمریں ۳۳ سال کی ہونگی۔
 دستار احمد، مرویات ابی ہریرہ، قریب قریب یہی مضمون ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت
 ابوسعید خدری سے بھی مروی ہے۔

۲۰ یعنی خوشحالی نے ان پر اٹا اثر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ اٹے کا فر نعمت
 ہو گئے تھے اپنی لذاتِ نفس میں منہمک ہو کر خدا کو بھول گئے تھے۔ اور گناہ عظیم پر مصر تھے "گناہ عظیم" کا لفظ
 جامع ہے۔ اس سے مراد کفر و شرک اور دہریت بھی ہے اور اخلاق و اعمال کا ہر برا
 گناہ بھی۔

تم شجرِ زقوم کی غذا کھانے والے ہو۔ اسی سے تم پیٹ بھر دو گے اور اوپر سے کھو تا ہوا پانی تو نرس لگے ہوتے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے بائیں بازو والوں کی ضیافت کا سامان روزِ جزا میں۔

ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا، یہ لطفہ جو تم ڈالتے ہو اس سے بچو تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے

اللہ زقوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۳۴۔

۲۱۲ یہاں سے آیت ۴ تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں ایک وقتِ آخرت اور توحید، دونوں پر استدلال کیا گیا ہے۔ چونکہ مکہ کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ان دونوں بنیادی اجزاء پر متعزز تھے اس لیے یہاں دلائل اس انداز سے دیئے گئے ہیں کہ آخرت کا ثبوت بھی ان سے ملتا ہے اور توحید کی صداقت کا بھی۔

۳۳ یعنی اس بات کی تصدیق کہ ہم ہی تمہارے رب اور معبود ہیں، اور ہم تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

۲۱۴ اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑا اہم سوال انسان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری

چیزوں کو چھوڑ کر انسان اگر صرف اسی ایک بات پر غور کرے کہ وہ خود کس طرح پیدا ہوا ہے تو اسے نہ قرآن کی

تعلیم توحید میں کوئی شک رہ سکتا ہے نہ اس کی تعلیمِ آخرت میں۔ انسان آخر اسی طرح تو پیدا ہوتا ہے کہ مرد اپنا

لطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر کیا اس لطفہ میں بچہ پیدا کرنے کی، اور لازماً انسان ہی کا بچہ پیدا کرنے کی

صلاحیت آپ سے آپ پیدا ہو گئی ہے؟ یا انسان نے خود پیدا کیا ہے؟ یا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کر دی ہے؟

اور کیا یہ مرد کے، یا عورت کے، یا دنیا کی کسی طاقت کے اختیار میں ہے کہ اس لطفے سے حمل کا استقرار کرادے؟

پھر استقرارِ حمل سے وضعِ حمل تک ماں کے پیٹ میں بچے کی درجہ بدرجہ تخلیق و پرورش اور ہرنپے کی الگ صورت گزرا

اور ہرنپے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک خاص شخصیت کا

انسان بن کر اٹھے، کیا یہ سب کچھ ایک خدا کے سوا کسی اور کا کام ہے؟ کیا اس میں کسی اور کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل ہے؟

کیا یہ کام ماں باپ خود کرتے ہیں؟ یا کوئی ڈاکٹر کرتا ہے؟ یا وہ انبیاء اور اولیاء کرتے ہیں جو خود اسی طرح پیدا ہوئے

ہیں؟ یا سورج اور چاند اور تارے کرتے ہیں جو خود ایک قانون کے غلام ہیں؟ یا وہ فطرت کرتی ہے جو بجائے خود

علم، حکمت، ارادے اور اختیار سے عاری ہے؟ پھر کیا یہ فیصلہ کرنا بھی خدا کے سوا کسی کے اختیار میں ہے کہ کچھ لٹی ہو

یا لڑکا؟ خوبصورت ہو یا بدصورت؟ طاقتور ہو یا کمزور؟ اندھا بہرا لنگڑا، ٹولا ہو یا سیسج الاعضاء؟ زمین ہو یا آگندہ زمین؟ پھر کیا خدا کے سوا کوئی اور یہ طے کرتا ہے کہ قوموں کی تاریخ میں کس وقت کس قوم کے اندر کن اچھی یا بُری صلاحیتوں کے آدمی پیدا کرے جو اسے عروج پر لے جائیں یا زوال کی طرف دھکیل دیں؟ اگر کوئی شخص خدا اور بٹ دھرمی میں متلا نہ ہو تو وہ خود محسوس کرے گا کہ شرک یا دہریت کی بنیاد پر ان سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا ان کا معقول جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پورا کا پورا خدا کا ساختہ و پرورش شدہ ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے ساختہ و پرورش شدہ اس انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خالق کے مقابلے میں آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے؟ یا اُس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بجالائے؟

توحید کی طرح یہ سوال آخرت کے معاملہ میں بھی فیصلہ کن ہے۔ انسان کی تخلیق ایک ایسے کپڑے سے ہوتی ہے جو طاقتور خوردبین کے بغیر نظر تک نہیں آسکتا۔ یہ کپڑا عورت کے جسم کی تاریکیوں میں کسی وقت اُس نسوانی انداز سے جا ملتا ہے جو اسی کی طرح ایک حقیقہ سا خوردبینی وجود ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خلیقہ بن جاتا ہے جو حیاتِ انسانی کا نقطہ آغاز ہے، اور یہ خلیقہ بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر اس کو نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس ذرا سے خلیقہ کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ ۹ مہینے چند روز کے اندر رحمِ مادر میں ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتا ہے، اور جب اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو ماں کا جسم خود ہی اسے دھکیل کر دنیا میں اودھم مچانے کے لیے باہر پھینک دیتا ہے۔ تمام انسان اسی طرح دنیا میں آئے ہیں اور شب و روز اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیدائش کا یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اس طرح انسانوں کو آج پیدا کر رہا ہے وہ کل کسی وقت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے ان انسانوں کو دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا۔

۵۔ یعنی تمہاری پیدائش کی طرح تمہاری موت بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم یہ طے کرتے ہیں کہ کس کو ماں کے پیٹ ہی میں مرجانا ہے، اور کسے پیدا ہوتے ہی مرجانا ہے، اور کسے کس عمر تک پہنچ کر مرنا ہے۔ جس کی موت کا جو وقت ہم نے مقدّر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی، اور اس کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے

اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو، پھر کہیں سبق نہیں لینے؟

سامنے مرتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر خود بھی اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو جان سکا ہے، نہ آتی ہوئی موت کو روک سکا ہے، نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعہ سے، کہاں، کس طرح واقع ہونے والی ہے۔

۲۶ یعنی جس طرح ہم اس سے عاجز نہ تھے کہ تمہیں تمہاری موجودہ شکل و سہیت میں پیدا کریں، اسی طرح ہم اس سے بھی عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری تخلیق کا طریقہ بدل کر کسی اور شکل و سہیت میں، کچھ دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ تم کو پیدا کر دیں۔ آج تم کو ہم اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ تمہارا لطفہ قرار پاتا ہے اور تم ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ بن کر ایک بچہ کی صورت میں برآمد ہوتے ہو۔ یہ طریقہ تخلیق بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر ہمارے پاس بس یہی ایک لگا بندھا طریقہ نہیں ہے جس کے سوا ہم کوئی اور طریقہ نہ جانتے ہوں، یا نہ عمل میں لاسکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم تمہیں اسی عمر کے انسان کی شکل میں پیدا کر سکتے ہیں جس عمر میں تم مرے تھے۔ آج تمہاری بنیائی سماعت اور دوسرے حواس کا پیمانہ ہم کچھ اور رکھا ہے۔ مگر ہمارے پاس انسان کے لیے بس یہی ایک پیمانہ نہیں ہے جسے ہم بدل نہ سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دینگے یہاں تک کہ تم وہ کچھ دیکھو اور سن سکو گے جو یہاں نہیں دیکھ سکتے اور نہیں سن سکتے۔ آج تمہاری کھال اور تمہارے ہاتھ پاؤں اور تمہاری آنکھوں میں کوئی گواہی نہیں ہے۔ مگر زبان کو بولنے کی طاقت ہم ہی نے تو دی ہے۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے روز تمہارا ہر عضو اور تمہارے جسم کی کھال کا ہر ٹکڑا ہمارے حکم سے بولنے لگے۔ آج تم ایک خاص عمر تک ہی جیتے ہو اور اس کے بعد مر جاتے ہو۔ یہ تمہارا جینا اور مرنا بھی بچا ہی مقرر کردہ ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کل ہم ایک دوسرا قانون تمہاری زندگی کے لیے بنا سکتے ہیں جس کے تحت تمہیں کبھی موت نہ آئے۔ آج تم ایک خاص حد تک ہی عذاب برداشت کر سکتے ہو، جس سے زائد عذاب اگر تمہیں دیا جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضابطہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ کل ہم تمہارے لیے ایک دوسرا ضابطہ بنا سکتے ہیں جس کے

کبھی تم نے سوچا، یہ بیچ جو تم بولتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اگانے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم یہاں تو ان کھیتوں کو ٹھیس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اٹنی سختی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔

کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے

تحت تم ایسا عذاب ایسی طویل مدت تک جھگت سکو گے جن کا تم تصور تک نہیں کر سکتے، اور کسی سنت سے سخت عذاب سے بھی تمہیں موت نہ آئے گی۔ آج تم سوچ نہیں سکتے کہ کوئی بوڑھا جوان ہو جائے، کبھی بیمار نہ ہو، کبھی اس پر بوڑھا پانہ آئے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ ایک ہی عمر کا جوان رہے۔ مگر یہاں جوانی پر بوڑھا پانہ ہمارے بنائے ہوئے قوانین حیات ہی کے مطابق تو آتا ہے۔ کل ہم تمہاری زندگی کے لیے کچھ دوسرے قوانین بنا سکتے ہیں جن کے مطابق جنت میں جاتے ہی ہر بوڑھا جوان ہو جائے اور اس کی جوانی و تندرستی لازوال ہو۔

۲۷ یعنی تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے کس طرح باپ کی صلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے۔ کس طرح رحم مادر میں، جو قبر سے کچھ کم تا ربیع نہ تھا، تمہیں پرورش کر کے زندہ انسان بنا یا گیا۔ کس طرح ایک ذرہ بے مقدار کو نشوونما دے کر یہ دل و دماغ، یہ آنکھ کان اور یہ ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے اور عقل و شعور، علم و حکمت، صنعت و ایجاد اور تدبیر و تفسیر کی یہ حیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ کیا یہ معجزہ مردوں کو دوبارہ جلا اٹھانے سے کچھ کم عجیب ہے؟ اس عجیب معجزے کو جب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خود اس کی زندہ شہادت کے طور پر دنیا میں موجود ہو تو کیوں اس سے یہ سبق نہیں لیتے کہ جس خدا کی قدرت سے یہ معجزہ شب و روز رونما ہو رہا ہے اسی کی قدرت سے زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا معجزہ بھی رونما ہو سکتا ہے؟

۲۸ اوپر کا سوال لوگوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے و پر دانستہ ہو اور اسی کی تخلیق سے وجود میں آئے ہو۔ اب یہ دوسرا سوال انہیں اس دوسری اہم حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جس رزق پر تم پلتے ہو وہ بھی اللہ ہی تمہارے لیے پیدا کرتا ہے جس طرح تمہاری پیدائش میں انسانی کوشش کا دخل اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کے اندر نطفہ ڈال دے

برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دین، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟

اسی طرح تمہارے رزق کی پیداوار میں بھی انسان کی کوشش کا دخل اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ کسان کھیتی میں بیج ڈال دے۔ زمین، جس میں یہ کاشت کی جاتی ہے، تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس زمین کو روئیدگی کی حالت میں نہ بنی ہوئی ہے۔ اس میں وہ مادے جن سے تمہاری غذا کا سامان ہم پہنچتا ہے، تم نے فراہم نہیں کیے ہیں۔ اس کے اندر جو بیج تم ڈالتے ہو ان کو نشوونما کے قابل تم نے نہیں بنایا ہے۔ ان بیجوں میں یہ صلاحیت کہ ہر بیج سے اسی نوع کا وراثت پھوٹے جس کا وہ بیج ہے، تم نے پیدا نہیں کی ہے۔ اس کاشت کو لہلہاتی کھیتوں میں تبدیل کرنے کے لیے زمین کے اندر جس عمل اور زمین کے اوپر جس ہوا، پانی، حرارت، برودت اور موسمی کیفیت کی ضرورت ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی تمہاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت اور اسی کی پروردگاری کا کرشمہ ہے۔ پھر جب تم وجود میں اسی کے لانے سے آئے ہو، اور اسی کے رزق سے پل رہے ہو، تو تم کو اس کے مقابلہ میں خود مختاری کا، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا حق آخر کیسے پہنچتا ہے؟

اس آیت کا ظاہر استدلال تو توحید کے حق میں ہے، مگر اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس پر اگر آدمی تھوڑا سا مزید غور کرے تو اسی کے اندر آخرت کی دلیل بھی مل جاتی ہے۔ جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مردہ ہوتا ہے، مگر زمین کی قبر میں جب کسان اس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر وہ نباتی زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے کہ نہیں پھوٹی ہیں اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شان بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مرمے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے جی جی کراٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اُس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے جس کی خبر قرآن ہمیں دے رہا ہے، یعنی انسانوں کی زندگی بعد موت۔

۲۹ یعنی تمہاری بھوک مٹانے ہی کا نہیں، تمہاری پیاس بجھانے کا انتظام بھی ہمارا ہی کیا ہوا ہے۔ یہ پانی جو تمہاری زندگی کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضروری ہے، تمہارا اپنا فراہم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اسے ہم فراہم کرتے ہیں۔ زمین میں یہ سمندر ہم نے پیدا کیے ہیں۔ ہمارے سورج کی گرمی سے ان کا پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے ہم نے اس پانی میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ ایک خاص قدر حرارت پر وہ بھاپ میں تبدیل ہو جاتے۔ ہماری

ہر اہم اسے لے کر اٹھتی ہیں۔ ہماری قدرت اور حکمت سے وہ بھاپ جمع ہو کر بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے حکم سے یہ بادل ایک خاص تناسب سے تقسیم ہو کر زمین کے مختلف خطوں پر پھیلتے ہیں تاکہ جس خطہ زمین کے لیے پانی کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے وہ اس کو پہنچ سکتے۔ اور ہم بالائی فضا میں وہ برودت پیدا کرتے ہیں جس سے یہ بھاپ پھر سے پانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ ہم نہیں صرف وجود میں لاکر ہی نہیں رہ گئے ہیں بلکہ تمہاری پرورش کے یہ سارے انتظامات بھی ہم کر رہے ہیں جن کے بغیر تم جی نہیں سکتے پھر ہماری تخلیق سے وجود میں آکر، ہمارا رزق کھا کر اور ہمارا پانی پی کر یہ حق تمہیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہمارے مقابلہ میں خود مختار رہو، یا ہمارے سوا کسی اور کی بندگی بجالاؤ؟

۱۔ اس فقرے میں اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں، ان میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کنسی ہی چیز کی تحلیل ہو جائیں، جب وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے اور صرف اپنے اصل آبی اجزاء کو لے کر ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں شامل رہتیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اٹھیں ان میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام روئے زمین کو زمین شور بنا دیتی۔ نہ انسان اُس پانی کو پی کر جی سکتا تھا، نہ کسی قسم کی نباتات اس سے اُگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی بھی عقل رکھتے ہوتے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اللہ ہی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت، جس کی بدولت کھاری سمندروں سے صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر بارش کی شکل میں برستا ہے اور پھر دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں آبِ رسانی و آبِ پاشی کی خدمت انجام دیتا ہے، اس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ ودیعت کرنے والے نے پانی میں اس کو خوب سوچ سمجھ کر بالاراہ اس مقصد کے لیے ودیعت کیا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری پانی سے پرورش پاسکتی تھی وہ اُس نے سمندر میں پیدا کی اور وہاں وہ خوب جی رہی ہے۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا میں پیدا کیا تھا اس کی پرورش کے لیے میٹھا پانی دیا گیا تھا اور اس کی فراہمی کے لیے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اڑے جو اس کے اندر تحلیل ہو گئی ہو۔

کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سداگتے ہو، اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامانِ زینت اسے باغِ اظہار کیوں یہ کفرانِ نعمت کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی اس بارش کو دیتاؤں کا کرشمہ سمجھتا ہے، اور کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ سمندر سے بادلوں کا اٹھنا اور پھر آسمان سے پانی بن کر برسا ایک فطری چکر ہے جو آپ سے آپ چل رہا ہے، اور کوئی اسے خدا کی رحمت سمجھتا بھی ہے تو اس خدا کا اپنے اوپر یہ حق نہیں ماننا کہ اسی کے آگے سب اعانت جھکائے؟ خدا کی اتنی بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہو اور پھر جواب میں کفر و شرک اور فسق و نافرمانی کرتے ہو؟

۳۲ درخت سے مراد یا تو وہ درخت ہیں جن سے آگ جلانے کے لیے لکڑی فراہم ہوتی ہے، یا مرنج اور عفار نامی وہ دو درخت ہیں جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو ایک دوسرے پر مار کر قدیم زمانے میں اہل عرب آگ جھاڑا کرتے تھے۔

۳۳ اس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ہر وقت روشن ہو کر انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے مختلف نہ ہو سکتی۔ آگ ہی سے انسان نے حیوانات کی طرح کچی غذا میں کھانے کے بجائے ان کو پکا کر کھانا شروع کیا اور پھر اس کے لیے صنعت و ایجاد کے نئے نئے دروازے کھلتے چلے گئے ظاہر ہے کہ اگر خدا وہ ذرائع پیدا نہ کرتا جن سے آگ جلاتی جاسکے، اور وہ آتش پذیر مادے پیدا نہ کرتا جو آگ سے جل سکیں، تو انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا نقل ہی نہ کہتا۔ مگر انسان یہ بات فراموش کر گیا ہے کہ اس کا خالق کوئی پروردگارِ حکیم ہے جس نے اسے ایک طرف انسانی قابلیتیں دے کر پیدا کیا تو دوسری طرف زمین میں وہ سر و سامان بھی پیدا کر دیا جس سے اس کی یہ قابلیتیں رُعب آسکیں۔ وہ اگر غفلت میں مدہوش نہ ہو تو نہ تو یہ آگ ہی اسے یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کس کے احسانات اور کس کی نعمتیں ہیں جن سے وہ دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔

۳۴ اصل میں لفظ مُقْبُوْبِیْنِ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف معنی اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ بعض نے صحرا میں اترے ہوئے مسافروں کے معنی میں لیتے ہیں بعض اس کے معنی بھوکے آدمی کے لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خواہ وہ کھانا پکانے کا فائدہ ہو یا روشنی

نیا ہے۔

پس اے نبی، اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کرو ^{۳۵}

کایاتیش کا۔

۳۵ یعنی اس کا مبارک نام کے کر یہ اظہار و اعلان کرو کہ وہ اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو کفار و مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو کفر و شرک کے ہر عقیدے اور منکرینِ آخرت کے ہر استدلال میں مضمر ہیں۔

ضروری تصحیح

اشاعت گزشتہ میں صفحہ ۲۸۵ پر تفسیر سورہ رحمن میں آیات ۴۸-۴۹ کا ترجمہ چھوٹ

گیا ہے۔ براہ کرم عبارت کو اس طرح درست کر لیں:

دونوں باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح اُبلتے ہوئے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات

کو تم جھلاؤ گے؟ اُن میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو

تم جھلاؤ گے؟